باب۔۲۵

ترجمہ

فص موسویہ

حکمت عُلویہ

فرعون کے بنی اسرائیل کے لڑکوں کو قتل کرنے میں کیا حکمت تھی اور کیا راز تھا۔۔؟ اس کا راز یہ تھا کہ جو جو لڑکے موسیٰ علیہ السلام کے واسطے مارے گئے تھے ان کی زندگی سے موسیٰؑ کو امداد ملے۔ کیوں کہ وہ لڑکے موسیٰؑ سمجھے جا کر مارے گئے تھے۔ فرعون نے جان بوجھ کر قتل کیا تھا، تو ان سب بچوں کی حیات، جو موسیٰؑ کے لیے مارے گئے تھے، حیاتِ موسویؑ کی طرف ضرور عَود کرے گی (لوٹے گی)۔ ان معصوم بچوں کی حیات، طاہر تھی (اور) فطرت پر تھی۔ اغراضِ نفسانی نے اس کو ناپاک نہیں کیا تھا بلکہ وہ، قَالُوا بَلٰی، (یعنی، وہ سرِ تسلیم خم کر دینے) کے عہد پر قائم تھے۔ لہٰذا موسیٰؑ کیا تھے؟ ان سب مقتولین کی حیات کا مجموعہ تھے جو ان کے دھوکے میں مارے گئے۔ یہ جنابِ موسیٰ علیہ السلام کے لیے خدائی اختصاص (یعنی خصوصیت رکھنا) ہے جو ان سے پہلے کسی اور کو نہ تھا۔ موسیٰؑ کی سوانح حیات میں بہت سے راز ہیں۔ میں ان میں سے چند کو اس باب میں لکھوں گا، مگر اُتنے ہی جتنے اللہ نے میرے دل میں ڈالے۔

یہ پہلا راز تھا جو اس باب میں مجھ سے کہا گیا۔۔۔ (کہ) موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تو بہت سی روحوں کا مجموعہ تھے، (چناں چہ) ان میں قوائے فعّالہ و موثرہ (یعنی مستعد اور پُر اثر قوتیں) جمع ہو گئی تھیں۔ کیوں کہ چھوٹوں کا اثر بڑوں پر کچھ نہ کچھ ہوتا ہی ہے۔ دیکھو بچہ بالخاصیۃ بڑے پر اثر کرتا ہے۔ اس کو خود داری و ریاست پر سے اُتار دیتا ہے، اور اپنی طرف مائل کر دیتا ہے۔ وہ بچے سے کھیلتا ہے، اس کو نچاتا ہے، اور بچے کی عقل کے موافق خود بھی بن جاتا ہے۔ پس بڑا، چھوٹے کا مسخّر اور زیرِ تصرف ہو جاتا ہے اور بڑے کو اس کا شعور و احساس تک نہیں ہوتا۔ پھر بچہ اپنی تربیت، حمایت اور خبر گیری میں بڑے کو مشغول کر دیتا ہے، اور وہ تنگ و بیزار نہیں ہوتا۔ یہ چھوٹے کا بڑے میں تصرف ہے۔ معصوم بچے کا مقام بھی اعلیٰ ہے، کیوں کہ بچے کو اللہ کے پاس سے آئے ہوئے تھوڑی مدت ہوتی ہے۔ وہ نومولود ہوتا ہے۔ (جب کہ) بڑے پر زیادہ

زمانہ گزرا ہوا ہوتا ہے۔ جو خدا سے قریب تر ہوگا وہ اس کو مسخّر کرلے گا۔ جو خدا سے بعید ہے، جیسے بادشاہ کے مصاحبین وندما (یعنی درباری اور ان کے ساتھی)، دُور والوں کو مطیع و مقہور (یعنی تابع اور مغلوب) کرلیتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ مبارک تھی (کہ) پانی برستا تو سر مبارک برہنہ فرما کر پانی کے نیچے نکل آتے کہ آپؐ پر پانی کے قطرے پڑ جائیں۔ اور فرماتے (کہ) اس کو پروردگار کے پاس سے آئے ہوئے تھوڑا زمانہ گذرا ہے۔ غور کرو! اُس رسولِ پاکؐ کی معرفت باللہ کس قدر بزرگ و برتر ہے۔ کس درجہ واضح ہے۔ دیکھو! مَطَر {بارش} نے افضل البشرؐ پر بھی اثر کیا۔ اس لیے کہ اُس کو ایک طرح کا قربِ رب تھا۔ یہ بارش کیا تھی، گویا ایک فرشتہ تھا جو آپؐ کے پاس وحی لاتا ہے۔ آپؐ بھی اس سے ملنے کے لیے زیرِ سما (آسمان کے نیچے) نکل آتے تاکہ پروردگار کے پاس سے جو (کچھ وہ) لایا ہے لے لیں۔ پانی کے قطروں کے جسدِ پاک پر پڑنے میں اگر کوئی الٰہی فائدہ نہ ہوتا تو رسول اللہ صلعم اس کے لیے صحن میں نکل نہ آتے۔ یہ پانی بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک مراسلہ ہے، ایک پیغام ہے جس سے ہر شئے کو حیات بخشتا (اور) زندہ کرتا ہے۔ اس کو خوب سمجھو۔

موسیٰؑ کو تابوت یعنی صندوق میں رکھ کر دریا میں ڈالنے سے کیا عبرت، کیا نصیحت (اور) کیا حکمت سمجھی جاسکتی ہے۔۔؟ تابوت کیا ہے۔۔؟ ناسوت ہے، یعنی جسم ہے۔ دریا کیا ہے، گویا وہ علم ہے جو اس جسم کے واسطے سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ علم کہاں کہاں سے آتا ہے۔۔؟ قوتِ نظری و فکری سے، قوتِ حسّی سے (اور) قوتِ خیالی سے۔۔۔ اگر یہ جسم عنصری نہ ہوتا تو نفسِ انسانی کو نہ ان قوتوں سے (اور نہ دوسری) قوتوں سے علوم ظاہری حاصل ہوسکتے (تھے)۔ جب نفس ناطقۂ انسانی اس جسم ناسوتی میں آگیا اور نفس جسم میں تصرف اور اس کی تدبیر و انتظام پر مامور ہوا تو یہ قویٰ اس کے آلات بنائے گئے۔ ان قویٰ کے ذریعے سے نفس اس تابوتِ تن کی تدبیر کرتا ہے۔ تدبیرِ بدن ہی مرادِ الٰہی ہے۔ اس تابوتِ بدن میں نور، سکینۂ ربّ جل و علا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس تابوتِ تن کو دریائے علم میں ڈال دیا تاکہ ان قویٰ کے ذریعے فنون و اقسام علوم کو حاصل کرے۔ اگرچہ روحِ مدبّر، بادشاہِ تن ناسوتی ہے مگر اللہ نے اس کو معلوم کرادیا کہ تدبیرِ بدن بغیر بدن سے متعلق ہوئے ممکن نہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان قویٰ کو اس کا خادم و ملازم بنادیا۔ وہ قویٰ کہاں ہیں۔۔؟ اس ناسوت و جسم میں، جس کو بابِ اشارات و حِکَم (اشارے، اعتبار اور حکمت کے عنوان) میں " تابوت " سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(نوٹ:) واضح ہو کہ شیخ (ابن عربیؒ) اور دیگر عرفا کی عادت ہے کہ ہر ایک کی بات سے جو کسی خاص غرض سے کہی گئی ہو، ایک قصّے سے جو کسی کا ہو، (یا) ہر ایک شعر سے جس کے معنیٰ کچھ ہی ہوں، ایک نصیحت لیتے ہیں، اور سارے قصے کو اپنے مطلوب پر ڈھال لیتے ہیں۔ اس کو اشارہ، اعتبار اور کبھی حکمت بھی کہہ دیتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوگیا کہ قرآن شریف کی تفسیر تو سیاق و سباق اور لغت و محاورات سے ہوتی ہے۔ اور اشارہ یا اعتبار ہم اپنے مقصد کے مطابق لیتے ہیں۔ لہٰذا اعتبار کو تفسیر سمجھنا غلطی ہے، اور عبرت لینے والے سے جھگڑا کرنا بے کار ہے۔ (مترجم)

یہی حال حق تعالیٰ کے تدبیر عالم کرنے کا ہے۔ عالم کی تدبیر، عالم سے یا اس کی صورت سے فرماتا ہے۔ بہر حال حق تعالیٰ تدبیر عالم، عالم ہی سے کرتا ہے۔ جیسے بیٹے کا پیدا ہونا باپ پر موقوف ہے۔ مسببات، اسباب پر موقوف ہیں۔ مشروطات شروط پر، معلولات علل پر، مدلولات دلائل وادِلہ پر، (اور) موجوداتِ محققہ معیّنہ حقائق پر موقوف ہیں۔ یہ سب چیزیں عالم ہی سے ہیں اور یہ حق تعالیٰ کی تدبیر وانتظام ہے۔ پس عالم کی تدبیر وانتظام (کو) عالم ہی کی چیزوں سے کیا گیا۔

صورتِ عالم سے ہماری مراد اسمائے حسنیٰ اور صفاتِ عُلیا ہیں جن سے حق تعالیٰ موسوم ومتّصف ہوتا ہے۔ کوئی اسم، اسمائے حسنیٰ سے ہم تک نہیں پہنچا، مگر یہ کہ اس کے معنیٰ وروح ہم عالم میں پاتے ہیں۔ بہر حال تدبیر عالم، صورت عالم یعنی اسماوصفات الٰہیہ سے حق تعالیٰ نے کی۔ یہی وجہ ہے کہ آدم کے حق میں جو جمیع صفات حضرت الٰہیہ کی فہرست اور نمونہ ہیں، اور اس میں ذات وصفات وافعال ہیں۔ کہا گیا، فانّ اللّٰہ خلق آدم علیٰ صورتہٖ، (یعنی) اللہ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا (حدیث۔ صحیح مسلم، مسند احمد، صحیح البخاری)۔ صورتِ حق کیا ہے۔۔؟ حضرتِ الٰہیہ کے سوا کچھ نہیں۔ حق تعالیٰ نے اس مختصر شریف یعنی انسانِ کامل میں جمیع اسمائے الٰہیہ کو رکھا اور اُن حقائق کو بھی جو اس کی حقیقت سے خارج اور عالم کبیر میں تفصیل وار ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسانِ کامل کو روحِ عالم بنادیا۔ اس کی کمال صورت کی وجہ سے علویات وسفلیات سب کو اس کا مسخّر بنادیا۔

جس طرح عالم میں کوئی شئے ایسی نہیں جو اللہ تعالیٰ کی تسبیح وتحمید نہ کرتی ہو۔ اسی طرح عالم میں کوئی شئے نہیں جو حقیقت، صورتِ انسان کی وجہ سے اس کی مسخّر ومطیع نہ ہو۔ (اللہ تعالیٰ) فرماتا ہے، وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ، (یعنی) اور {اللہ تعالیٰ نے} آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب کو اپنی طرف سے تمھارا مسخّر کر دیا، (الجاثیہ:۱۳)۔ پس عالم میں جو کچھ ہے تحتِ تسخیرِ انسان ہے۔ اس بات کو انسانِ کامل جانتا ہے۔ اور انسانِ حیوان نہیں جان سکتا۔

بظاہر جنابِ موسیٰؑ کو تابوت میں، اور تابوت کو دریا میں ڈالنا، ہلاکت کی صورت ہے، مگر بباطن قتل سے نجات ہے۔ جیسے علم سے نفوس زندہ ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، أَوَمَن كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنَاهُ وَجَعَلْنَا لَهُ نُورًا يَمْشِي بِهِ فِي النَّاسِ كَمَن مَّثَلُهُ فِي الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا، (یعنی) کیا جو شخص کہ تھا مردہ {یعنی جاہل} پھر ہم نے اس کو زندہ کیا {یعنی علم سے} اور اس کے لیے نور {یعنی ہدایت} عطا کی، اس شخص کی حالت اس مانند ہے جو تاریکیوں میں ہے {یعنی ضلال وگمراہی میں} کہ اس سے نہ نکلے گا {یعنی کبھی ہدایت نہ پائے گا}، (الانعام:۱۲۲)۔ اس لیے کہ امر واقعی کی کوئی انتہا نہیں، کوئی غایت نہیں، کہ آدمی وہاں پہنچ کر ٹھیر جائے۔ ہدایت یہی ہے کہ حیرت کی طرف انسان کو راہ ملے۔ وہ جان لے کہ امر مطلوب ہی حیرت ہے۔ اور حیرت، قَلق یعنی اضطراب وحرکت ہے۔

اور حرکت، حیات ہے۔ پس نہ سکون ہے نہ موت ہے۔ اور وجود ہی وجود ہے۔ عدم کا یہاں قدم نہیں۔ ایسا ہی حال ہے آبِ علم کا جس سے زمین قلب کی حیات و حرکت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے،[(وَتَرَى الْأَرْضَ هَامِدَةً فَإِذَا أَنزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ)اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَأَنبَتَتْ مِن كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ،(یعنی تم دیکھتے ہو کہ زمین خشک پڑی رہتی ہے، پھر جب ہم پانی برساتے ہیں)تو وہ لہلہاتی ہے اور پھولتی پھلتی ہے اور ہر قسم کے تروتازہ نباتات کو اگاتی ہے، (الحج:۶)]۔ اور اُگاتی ہے نفیس و بارونق جوڑے، یعنی نہیں جنتی مگر اس کو جو اس کے مشابہ ہے، یعنی اس کی طرح طبعی ہے۔ زمین کی زوجیت و شفعیت ان چیزوں کے لحاظ سے ہے جو اس سے پیدا و ظاہر ہوتے ہیں۔ اسی طرح وجودِ حق گو کہ واحد ہے مگر اس کو کثرت لاحق ہوئی۔ متعدد اسما پیدا ہوئے کہ یہ چیز ایسی ہے، وہ چیز ویسی ہے۔ یہ سبب کس کا اقتضا ہے۔۔؟ عالم کا۔ عالم، حق تعالیٰ سے ظاہر ہوا۔ وہ اپنی نشاءت و پیدائش کی وجہ سے حقائقِ اسماے الٰہی کو طلب کرتا ہے۔ پس بوجہ عالم اور اسماے الٰہیہ کے جو اس کے خالق ہیں حق تعالیٰ کے لیے کُل ہونا ثابت ہوا۔ اور وہ بلحاظ اپنی ذاتِ مقدسہ کے ،احدی العین(اور) شخصِ معین ہے۔۔۔ جیسے ہیولیٰ، کہ اپنی ذات کی وجہ سے ایک ہے مگر ظاہری صور کی وجہ سے کثیر ہے۔ ہیولیٰ بذاتہٖ ان صور کثیرہ کا حامل ہے۔ اسی طرح حق تعالیٰ باوجود ایک ہونے کے صورِ تجلیات کی وجہ سے اس کو کثرت عارض ہوئی۔ پس حق تعالیٰ، باوجود احدیت کے، تجلی گاہ ہے صور عالم کا، جو معقول سمجھ میں آتی ہے۔ دیکھو! یہ تعلیم الٰہی کس قدر اچھی اور نفس الامری ہے، مگر اس کی معرفت و اطلاع اُسی بندے کو ہوتی ہے جو اللہ کا خاص بندہ ہے۔

جب آلِ فرعون نے موسیٰؑ کو دریا میں درخت کے پاس پایا تو فرعون نے ان کا نام موسیٰ رکھا۔ {مُو} کے معنیٰ قبطی زبان میں' پانی' کے ہیں۔ اور{سا} کے معنی قبطی زبان میں' درخت' کے ہیں۔ موسیٰؑ کو دریا اور درخت کے پاس پایا تو ان کا نام موسیٰ رکھا۔ کیوں کہ ان کا تابوت یعنی صندوق دریا میں درخت کے پاس ٹھیرا تھا۔

جب موسیٰؑ کا تابوت دریا سے نکال لیا گیا تو فرعون نے چاہا کہ موسیٰؑ کو قتل کر دے تو اس کی بیوی آسیہ نے کہا("یہ بچہ میری اور تیری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے")۔ شیخ (ابن عربیؒ) کہتے ہیں (کہ) آسیہ کا یہ کہنا الہامی تھا۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو (یعنی موسیٰؑ کو) کمال کے لیے پیدا کیا تھا۔

محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم، آسیہ و مریم بنت عمران کے متعلق فرماتے ہیں(کہ وہ)اس کمال کی شہادت دیتے ہیں جو مردوں کو دیا جاتا ہے۔ آسیہ نے فرعون سے موسیٰؑ کے حق میں کہا کہ "یہ بچہ یعنی موسیٰ میری اور تیری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے"۔ موسیٰؑ کا آسیہ کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہونا تو ظاہر ہے کہ موسیٰؑ سے آسیہ کو ایمان اور مردوں کا کمال دیا گیا، جیسا کہ ہم نے ابھی بیان کیا۔ اور فرعون کی آنکھوں کی ٹھنڈک اس وجہ سے کہ شیخؒ خیال میں فرعون ڈوبتے ڈوبتے ایمان سے مرا ہے، پاک صاف مرا ہے۔ اُس میں مرتے وقت کچھ خباثت

باقی نہیں رہی تھی۔ وہ ایمان سے مرا ہے۔ ایمان لا کر اس نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ اسلام ما قبل کے تمام گناہوں کو محو کر دیتا ہے، (مٹا دیتا ہے)۔۔۔ اللہ نے فرعون کو اپنی رحمت کی ایک نشانی و دلیل بنا دی ہے کہ کوئی بندہ، رحمت الٰہی سے مایوس نہ ہو۔ اللہ کی رحمت سے قوم کفار ہی مایوس ہوتی ہے۔ اگر فرعون حالتِ یاس میں ہوتا تو ایمان لانے میں جلدی اور مبادرت (یعنی تیزی) نہ کرتا۔ لہٰذا موسیٰؑ ایسے ہی تھے جیسے ان کے متعلق آسیہ، زوجہ فرعون نے کہا تھا کہ "موسیٰ میرے اور تیرے {یعنی فرعون} کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک بنے گا، اسے مت قتل کرو، شاید کہ ہم کو نفع دے"۔

شیخ (ابن عربیؒ) کہتے ہیں: اور ہوا بھی ایسا ہی۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اُن دونوں کو نفع دیا۔ اگرچہ ان کو معلوم نہ ہوا (کہ) یہ وہی نبی ہے جس کے ہاتھ پر ملک فرعون اور متعلقین وغیرہ کی تباہی ہو گی۔

مترجم کہتا ہے (یعنی حضرت عبد القدیرؒ فرماتے ہیں):

یہ وہ معرکتہ الآرا مقام ہے کہ اس کی تائید و تردید میں کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ شیخؒ کی تکفیر تک کی گئی۔ حضرت عبد الوہاب شعرانیؒ کہتے ہیں کہ میں نے خود شیخؒ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتاب فصوص دیکھی۔ اس میں نجاتِ فرعون کے متعلق کچھ بھی نہیں لکھا تھا۔ شیخؒ کے نجاتِ فرعون پر استدلالات تو آپ نے دیکھ لیے۔ (اب) عدم اسلام فرعون کے چند دلائل بھی دیکھ لیجئے۔

يَقْدُمُ قَوْمَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَأَوْرَدَهُمُ النَّارَ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُودُ - وَأُتْبِعُوا فِي هَـٰذِهِ لَعْنَةً وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُودُ، (یعنی) آگے ہو گا فرعون اپنی قوم کے ساتھ قیامت کے دن۔ پہنچائے گا ان کو دوزخ پر اور برا گھاٹ ہے دوزخ جس پر پہنچے۔ اور پیچھے سے ملتی رہی اس جہاں میں لعنت اور روز قیامت بھی برا بدلہ ہے جو ان کو ملا، (ھود: ۹۸ اور ۹۹)۔

وَقَالَ مُوسَىٰ رَبَّنَا إِنَّكَ آتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَأَهُ زِينَةً وَأَمْوَالًا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوا عَن سَبِيلِكَ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلَىٰ أَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوا حَتَّىٰ يَرَوُا الْعَذَابَ الْأَلِيمَ - قَالَ قَدْ أُجِيبَت دَّعْوَتُكُمَا، (یعنی) اور کہا موسیٰ نے! اے رب ہمارے، تو نے دی ہے فرعون کو اور اس کے سرداروں کو رونق اور مال، دنیا کی زندگی میں، اے رب تا کہ بہکا دیں تیری راہ سے، اے رب مٹا دے ان کے مال اور سخت کر ان کے دل کو کہ نہ ایمان لائیں جب تک کہ دیکھیں دُکھ کی مار۔ فرمایا! قبول ہو چکی تمھاری دعا، (یونس: ۸۸ اور ۸۹)۔

آلْآنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنتَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ، (یعنی) اب خدا کا اقرار کرتا ہے، اور تُو رہا بے حکم پہلے اور رہا بگاڑنے والوں میں، (یونس: ۹۱)۔

جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے شر سے بچایا (تو) وَأَصْبَحَ فُؤَادُ أُمِّ مُوسَىٰ فَارِغًا، (یعنی) موسیٰ کی ماں کا دل خالی ہو گیا، (القصص: ۱۰)۔ یعنی اس ہم و غم سے کہ ان کو پہنچا تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ پر دائیوں کے دودھ کو حرام کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ انھوں نے اپنی ماں کے سینے کی طرف توجہ کی۔ پھر ان کی ماں نے ان کو دودھ پلایا، اور اللہ نے ان کی ماں کی خوشی پوری کی۔

ایسا ہی علم شرائع کا حال ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا، (یعنی) ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے عام و خاص راستہ مقرر کیا، (المائدۃ:۴۸)۔ یہ چھوٹا راستہ، اصل اور بڑے راستے ہی سے نکلتا ہے۔ اصل ہی سے فرع (یعنی شاخ) کو غذا ملتی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کو بھی اصل یعنی اپنی ماں (ہی) سے غذا ملی، جس طرح درخت کی ڈالیوں کو جڑ سے غذا ملتی ہے۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک شئے ایک شریعت میں حرام ہوتی ہے اور وہی دوسری شریعت میں حلال ہوتی ہے۔ یہ بھی ظاہری صورت کے لحاظ سے ہے یعنی کسی چیز کا حلال ہونا نفس الامر میں تو حال کی چیز اور ماضی کی چیز ایک نہیں ہوتی۔ کیوں کہ واقعے کے لحاظ سے تو ایک نیا ہی حکم اور نئی ہی پیدائش ہے۔۔۔ خلق کیا ہے۔۔؟ تجلّی جدید ہے۔ تجددِ امثال ہے۔ اور تجلّی میں تو تکرار نہیں ہوتی۔ اسی وجہ سے ہم نے تم کو متنبہ کیا۔ اسی بات کو تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ کے حق میں تحریم مراضع یعنی دائیوں کے دودھ کے موسیٰؑ پر حرام کرنے سے کنایہ (یعنی اشارتاً ذکر) فرمایا۔ سچ پوچھو تو حقیقت میں ماں وہی ہے جس نے دودھ پلایا نہ (کہ) وہ، جس نے جنا۔ اس لیے کہ جننے والی ماں تو امانت کے طور پر حاملہ رہی۔ بچہ اس کے پیٹ سے پیدا ہوا۔ اس کے خونِ حیض سے غذا حاصل کی۔ یہ سب اس کے بغیر ارادے کے تھا، تاکہ ماں کا بچے پر غیر معمولی احسان و امتنان نہ ہو۔ (بچے نے) خون کو غذا کیا، (وہ) اگر اس خون کو غذا نہ کرتا اور وہ خون نہ نکلتا تو ماں ہلاکت میں پڑ جاتی یا بیمار ہو جاتی۔ اس لحاظ سے تو کچھ بچے ہی کا احسان ماں پر ہے کیوں کہ اس نے اس خون کو اپنی غذا بنالی اور ماں کو ضرر سے بچالیا۔ اگر یہ خون رک جاتا اور نہ نکلتا اور بچہ اس کو اپنی غذا نہ بنالیتا تو ماں کو ضرر پہنچ جاتا۔ دودھ پلانے والی دائی کا یہ حال نہیں ہے۔ اس نے تو دودھ پلا کر اس کی حیات و بقا کا ارادہ کیا ہے۔ (یہاں) اللہ تعالیٰ نے دودھ پلانے کا کام بھی ماں ہی سے لیا تاکہ موسیٰ علیہ السلام پر ان کی ماں کے سوا کسی اور عورت کا احسان نہ ہو۔ (اللہ تعالیٰ فرماتا ہے) كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ، (تاکہ ان کی یعنی) {مادرِ موسیٰ کی} آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور وہ غمگین نہ ہوں، (طٰہٰ:۴۰ اور القصص:۱۳)۔ (وہ) موسیٰؑ کو پالیں، پرورش کریں (اور) ان کو اپنی گود میں نشو و نما پاتے دیکھیں۔

اللہ تعالیٰ نے بند تابوت سے موسیٰؑ کو نجات دی۔ پھر موسیٰؑ کے حجابِ ظلمت طبیعت کو پھاڑ دیا۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو علم الٰہی عطا فرمایا تھا۔ اگرچہ طبیعت سے پورے پورے طور پر نہ نکلے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا بہت سی جگہ امتحان لیا تاکہ ابتلاءات و مصائب میں ان کا صبر و تحمل ثابت ہو جائے۔

پہلا ابتلا (یا امتحان) موسیٰؑ کا قبطی کو قتل کرنا ہے۔ یہ قبطی قوم فرعون سے تھا۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ کو ان کے باطن میں اس کی توفیق دی، اس کا الہام کیا۔ اگرچہ ان کو معلوم نہ تھا کہ یہ الہام ہے۔ مگر انھوں نے اپنے دل میں اس قتل کی پرواہ نہ کی، باوجود یہ کہ انھوں نے وحی آنے تک تاخیر نہیں کی۔ کیوں کہ نبی، معصوم دل کا ہوتا ہے، گو کہ اس کا انھیں شعور نہیں رہتا۔ یہاں تک کہ وہ نبی ہو جائیں اور ان کی عصمت کی انھیں خبر ہو۔

اسی واسطے موسیٰؑ کو خضر علیہ السلام نے ایک لڑکا قتل کر کے دکھایا اور موسیٰؑ نے ان پر اعتراض کیا۔ اور خود موسیٰؑ نے قبطی کو جو قتل کیا تھا اس کو بھول گئے۔ اس پر خضرؑ نے موسیٰؑ سے کہا، وَمَا فَعَلْتُهُ عَنْ أَمْرِي، (یعنی) اور میں نے اس قتل کو خود سے نہیں کیا، (الکھف:۸۲)۔ وہ موسیٰؑ کو ان کے قبلِ نبوت مرتبے کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ موسیٰؑ نفس الامر میں معصوم الحرکۃ تھے، اگرچہ ان کو اس کا علم نہ تھا۔ اور خضرؑ نے ان کو کشتی توڑ کر بھی بتلا دیا کہ بظاہر اس میں کشتی کا نقصان تھا اور بباطن اس میں غاصب کے ہاتھ سے اس کو بچانا تھا۔ خضرؑ نے اس کو تابوتِ موسیٰؑ کے مقابل کیا۔ جس پر دریا چاروں طرف سے موجزن تھا۔ اس میں بھی بظاہر ہلاکت اور بباطن نجات تھی۔ جیسا کہ مادرِ موسیٰؑ نے اس خوف سے کیا تھا کہ کہیں غاصب فرعون کا موسیٰؑ پر دسترس نہ ہو اور ان کو پکڑ کر ذبح نہ کر ڈالے اور ماں کھڑی دیکھتی رہ جائے۔ مادرِ موسیٰؑ کا دریا میں تابوتِ موسیٰ کو ڈال دینا الہام خداوندی سے تھا۔ اور ان کو اس کی خبر تک نہ تھی۔ ان کے دل میں آ گیا تھا کہ وہ موسیٰ کو ضرور دودھ پلائیں گی۔ پھر جب موسیٰؑ کے متعلق خوف ہوا تو ان کو دریا میں ڈال دیا، کیوں کہ مثل مشہور ہے (کہ) "نہ آنکھ دیکھے نہ دل کو درد ہو"۔ ان کو ایسا خوف و غم نہ ہوا جیسا کہ قتلِ موسیٰ آنکھوں کے سامنے ہوتا، تو ہوتا۔ ان کو اس کا گمانِ غالب پیدا ہو گیا تھا کہ شاید ان کے حسنِ ظن کی وجہ سے رحمتِ الٰہی سے اللہ موسیٰؑ کو ان کی طرف واپس لائے۔ وہ اس دلی حسنِ ظن پر جی رہی تھیں۔ ان کی امید خوف و یاس سے مقابلہ کر رہی تھی۔ جب اس کا الہام ہوا تو اپنے جی میں کہنے لگیں کہ شاید یہ وہی رسول ہو جس کے ہاتھ پر فرعون اور قبطیوں کی ہلاکت ہو۔ اس گمان پر وہ جیتی اور خوش رہیں۔ ان کا ایسا گمان نفس الامری (یعنی سچا) اور اللہ تعالیٰ کے پاس محقق (یعنی اٹل) تھا۔

پھر جب موسیٰؑ پر مقدمہ قصاصِ قبطی میں وارنٹ نکلا اور حکمنامۂ گرفتاری جاری ہوا تو وہ بظاہر بھاگ کھڑے ہوئے۔ حقیقتًا ان کا چل دینا حبِّ نجات پر مبنی تھا۔ کیوں کہ حرکت ہمیشہ مبنی بر حُب رہتی ہے۔ دیکھنے والے دوسرے اسباب کی طرف نسبت کر کے محجوب رہ جاتے ہیں۔ حالاں کہ واقع میں ایسا نہیں ہے۔ اس لیے کہ اصل یہ ہے کہ عالم کی حرکت، عدم سے جس میں وہ ساکن تھا وجود کی طرف ہوتی ہے۔ یعنی علم الٰہی سے عالم شہادت کی طرف ہوتی ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ساری دنیا سکون سے حرکت کرنے پر مبنی ہے۔ حرکت جو مسبّب وجود عالم ہے، حق تعالیٰ کی حرکتِ حبی ہے۔

اسی حرکتِ حبی پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیثِ قدسی سے اس طرح آگاہی بخشی ہے۔ **كنت كنزًا مخفيًا (لا اعرف) فاحببت ان اعرف فخلقت الخلق**، (یعنی) میں ایک گنج مخفی تھا، مجھے کوئی نہیں پہچانتا تھا، تو میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں لہٰذا میں نے خلق کو پیدا کیا (حدیث قدسی۔ الأسرار المرفوعة في الأخبار الموضوعة، تذكرة الموضوعات للفتني)۔

دیکھو! اگر یہ محبت نہ ہوتی تو عالم، وجود خارجی میں پیدا ہی نہ ہوتا۔ پس عالم کو، عدم سے وجود کی طرف، حرکت ہے۔ حرکت موجد ہے ایجادِ عالم کے لیے۔ نیز عالم بھی، جس طرح ثبوتِ علمی میں نمایاں تھا خود کو وجودِ خارجی میں نمایاں ہونے کو دوست رکھتا ہے۔ غرض یہ کہ ہر وجہ سے عالم کی حرکت، عدم ثبوتی سے وجودِ خارجی کی طرف حبی ہے، خواہ جانبِ حق سے، خواہ جانبِ عالم سے۔ اس لیے کہ عالم بذاتہٖ محبوب ہے۔ یہاں کمالاتِ الٰہی سے مراد کمالاتِ صفاتی و افعالی ہیں۔ اور حق تعالیٰ کا اپنی ذاتِ مقدّسہ کو جاننا (ہے)، یعنی علم ذاتی کے لحاظ سے وہ غنی عن العالمین (ہے)، تمام عوالم سے بے نیاز ہے اور یہ علم، خاصّۂ خداوندی ہے (اللہ تعالیٰ کی ایک خصوصیت ہے)۔

علم ذاتی و فعلی، جو اشیا کے پیدا ہونے سے پہلے تھا، وہ تو قدیم و ازلی ہے۔ پھر کونسا علم ہے جو باقی رہ گیا ہے۔ علم انفعالی حادث، جو اشیا کے خارج میں حادث ہونے سے حادث ہوتا ہے۔ پس صورتِ کمال، علم حادث و قدیم سے ظاہر ہوتی ہے۔ پس مرتبۂ علمی کا کمال، حدوث و قدم دونوں راہ سے ہو جاتا ہے۔

اسی طرح مراتبِ وجود حق کی بھی تکمیل ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ وجود کی دو قسمیں ہیں، ازلی و غیر ازلی حادث۔ وجود ازلی تو وجود بالذات حق تعالیٰ کا ہے۔ اور غیر ازلی، وجودِ حق ہے مگر صور عالم میں (اور) جو علم میں تھے۔ اس وجود خارجی و شہودی کو 'حدوث' کہتے ہیں۔ اس وجود بالعرض و حادث میں بعض حادث، بعض حادث کے سامنے ظاہر ہوتے ہیں۔ اور حق تعالیٰ خود اپنے سامنے صور عالم میں ظاہر ہوا۔ اب وجود کامل ہو گیا۔ اس تقریر سے ثابت ہو گیا کہ حرکتِ عالم، تحصیلِ کمال کے لیے، حرکتِ حبی ہے۔ اس کو خوب سمجھو۔

دیکھو! اسمائے الٰہیہ اپنے آثار کا ظہور ذات و عین عالم میں نہ دیکھ کر کیسے بے قرار تھے۔ پھر ظہور آثار کے بعد کیسی راحت ہوئی۔ غرض کہ اس کو راحت محبوب و مطلوب تھی۔ یہ راحت کب ملی۔۔؟ جب اعلیٰ و اسفل کی صورتوں کو وجودِ خارجی ملا۔ پس ثابت ہو گیا کہ حرکت، لوازم حُب سے ہے۔ پس عالم میں کوئی حرکت نہیں مگر وہ محبت پر مبنی ہے۔ بعض علما اس مسئلے کو جانتے ہیں اور بعض سببِ قریب (یا لوگوں کے ڈر) کی وجہ سے محجوب و ناواقف رہ جاتے ہیں۔ کیوں کہ سببِ قریب کا حکم ظاہر رہتا ہے اور نفسِ انسانی پر اس کا غلبہ رہتا ہے۔ اس لیے کہ دنیا ظاہر پرست ہے۔

موسیٰؑ کو قتلِ قبطی کی وجہ سے خوف ظاہر تھا۔ مگر یہ خوف بھی قصاص قتلِ قبطی سے حبِ نجات پر متضمّن و مشتمل تھا۔ پس خوف واقع ہوا تو (وہ) بھاگے۔ مگر حقیقت میں نجات کو محبوب جانا۔ کس سے۔۔؟ فرعون سے اور اس کے عمل سے۔ موسیٰؑ نے سببِ قریب یعنی خوفِ قصاص کو، جو فی الحقیقت ظاہر و مشہود ہو رہا تھا، بیان فرمایا۔ خوف آدمی کے لیے بمنزلہ صورتِ جسمی کے (ہے)، اور حبِّ نجات بمنزلہ رُوح مدبّر بدن کے (ہے)۔

انبیا علیہم السلام بالکل ظاہری زبان میں بات چیت کرتے ہیں۔ ان کا خطاب عام فہم ہوتا ہے۔ کیوں کہ ان کو سامع عالم کی سمجھ، اور فہم پر اعتماد رہتا ہے کہ وہ حقیقتِ مسئلہ سے واقف ہو ہی جائے گا۔ رسولوں کو عامۃ الناس (یعنی عام لوگوں) کا بڑا لحاظ رہتا ہے۔ کیوں کہ وہ اہل فہم کے مرتبے کو جانتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مرتبۂ خاص پر (ایک) عطایا میں متنبہ فرمایا۔ حضورؐ مال تقسیم فرما رہے تھے۔ ایک نو مسلم کو مال دیا اور ایک مضبوط ایمان والے نیک آدمی کو نہ دیا۔ سعدؓ بن وقاص نے اس نیک آدمی کی سفارش کی تو حضورؐ نے فرمایا، "میں ایک آدمی کو دیتا ہوں، اس خوف سے کہ کہیں وہ مرتد نہ ہو جائے اور اس کو اللہ دوزخ میں نہ ڈال دے، حالاں کہ اس کے سوا دوسرا آدمی مجھے اس سے عزیز تر ہے"۔۔۔ دیکھو! حضورؐ نے ضعیف العقل، ضعیف النظر والفکر کی رعایت کی۔ اس لیے کہ اس میں طمع (لالچ) اور کدورتِ طبعی (بدمزاجی) غالب تھی۔

عطایاے مالی میں جس طرح عامۃ الناس کا لحاظ رکھا گیا اسی طرح عطایاے علمی میں (بھی) عامۃ الناس کا لحاظ کیا جاتا ہے۔ بیان، عام مگر جوامع الکلم رہتا ہے۔ عرفا اُس کے مغز سخن (یعنی بات کے معیار) کو پہنچتے ہیں۔ اور ظاہر میں ظاہر سے خوش ہوتے ہیں۔ عظیم الشان معنٰی پر عام فہمی کا خوبصورت خلعت (پوشاک) پہناتے ہیں کہ کم فہم وہیں ٹھیر جائے اور کہنے لگے، "کیا اچھا خلعت (لباس) ہے"۔ غریب سمجھتا ہے کہ یہ معمولی عام فہم الفاظ، نہایت بلند مرتبے میں ہیں۔ صاحبِ فہم دقیق جو حکمت کے موتیوں کو غوطہ مار کر نکالتا ہے وہ سمجھتا ہے۔ دل میں کہتا ہے بادشاہ نے اس کو خلعت دیا تو کیوں۔ پھر غور کرتا ہے کہ یہ خلعت کس قیمت کا ہے۔ اور اس کا کپڑا کس قسم کا ہے۔ اس خلعت کی حیثیت سے اس شخص کی حیثیت کا اندازہ لگاتا ہے جس کو خلعت دیا گیا ہے۔ اس کو ایسے حقائق کا انکشاف ہوتا ہے جو نادانوں کو نہیں ہو سکتا۔

انبیا و رسل اور ان کے جانشین حضرات نے جب یہ دیکھا کہ دنیا میں اور ان کی امّت میں اس قسم کے نادان و کم فہم لوگ بھی ہیں تو اپنے بیان میں زبانِ ظاہر اور عام فہم کو اختیار کیا، جس میں عام و خاص سب شریک ہیں۔ خاص افراد وہ سب سمجھتے ہیں جو عامۃ الناس سمجھتے ہیں اور اس سے زیادہ بھی سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ تو ہے کہ عامۃ الناس سے امتیاز اور رسم خاص رکھتے ہیں۔ علوم کی تبلیغ کرنے والوں نے زبانِ ظاہر پر اکتفا کیا۔ یہ حکمت تھی موسیٰؑ کے اس فرمانے کی، فَفَرَرْتُ مِنكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ، (یعنی) میں تم سے بھاگا، جب تم سے ڈرا، (الشعراء:۲۱)۔ آپؑ نے یہ نہ فرمایا (کہ) میں تمھارے پاس سے حُبِ سلامتی و عافیت کی وجہ سے بھاگا۔

موسیٰ علیہ السلام شہر مدائن میں پہنچے جہاں شعیب علیہ السلام رہتے تھے۔ ان کی دو صاحبزادیاں پنگھٹ پر پانی بھرنے آئیں۔ آپ نے بغیر اجرت کے ان کی بکریوں کو پانی پلا دیا۔ پھر زیرِ سایۂ الٰہی جو درخت کی

صورت میں نمایاں تھا واپس جا بیٹھے اور دعا کی، رَبِّ إِنِّي لِمَا أَنزَلْتَ إِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيرٌ، (یعنی) میرے پروردگار! تو نے مجھ پر جو خیر اور بھلائی اتاری ہے میں اس کا محتاج ہوں، (القصص:۲۴)۔ موسیٰؑ نے لِلّٰہ، بے اجرت پانی پلانے کو وہ خیر سمجھا جس کو اللہ نے اُن پر اتارا۔ موسیٰؑ نے خود کو محتاج و فقیر ظاہر کیا، اُس خیر کی طرف جو عند اللہ ہے۔ جب موسیٰؑ کے سامنے بغیر اجرت کے دیوار کھڑی کر دی اور اپنا بھی ایک کام بغیر اجرت کے دکھا دیا تو موسیٰؑ نے اس پر خضرؑ کو معتوب کیا، اور ناخوشی ظاہر کی۔ تو خضر علیہ السلام نے ان سے بغیر اجرت پانی پلا دینے کا خود ان کا واقعہ یاد دلایا۔ اس کے سوا اور بہت سی باتیں ہیں جن کا ذکر کیا گیا۔ اس قصّے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمنا کی کہ کاش موسیٰ سکوت اختیار کرتے اور اعتراض نہ کرتے، تاکہ اللہ تعالیٰ موسیٰؑ و خضرؑ کا پورا قصہ بیان فرماتا اور حضورؐ کو بھی معلوم ہو جاتا کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ کو باوجود نادانستگی کے کن کن نیک کاموں کا الہام فرمایا اور ان سے واقف کرا دیا تھا۔ کیوں کہ موسیٰؑ اگر واقف ہوتے تو ان کاموں پر خضرؑ پر اعتراض نہ کرتے۔ حالاں کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ کے پاس خضرؑ کے اچھے ہونے کی شہادت دی تھی اور ان کا تزکیہ و تعدیل (یعنی اصلاح و درستی) کی تھی۔ باوجود اس کے، موسیٰؑ کو اللہ تعالیٰ کے تزکیۂ خضر کا اور اتباع خضرؑ کی شرط کا خیال نہ رہا کہ جب تک وہ بیان نہ کریں، سوال نہ کریں۔ یہ بھی ہم پر اللہ کی رحمت ہے جب کہ امر الٰہی کو بھول جائیں۔

اگر سچ پوچھیے غفلت نشان، شانِ رحمت ہے

اگر موسیٰؑ کو اس کا علم رہتا تو خضرؑ ان سے (یہ) نہ کہتے، مَا لَمْ تُحِطْ بِهِ خُبْرًا، (یعنی) وہ چیز جس کا تم کو احاطہ و علم نہیں، (الکھف:۶۸)۔ میں ایک علم پر ہوں جس کا ذوق تم کو نہیں۔ جیسے کہ تم ایک علم پر ہو کہ جس کو میں نہیں جانتا۔ یعنی تم کو کلّیات کا علم ہے اور مجھ کو خاص خاص جزئیات کا۔ اس جواب میں خضرؑ نے انصاف سے کام لیا۔

اس امر کی حکمت کہ موسیٰؑ نے خضرؑ کو کیوں چھوڑا، یہ ہے کہ رسول کے حق میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانتَهُوا، (یعنی) تم کو رسول جو کچھ دے اس کو لے لو، اور جس سے منع کرے اس سے باز رہو، (الحشر:۷)۔ خدا شناس علما جو قدرِ رسالت و رسول جانتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے سامنے ٹھیر جاتے ہیں۔ خضرؑ کو معلوم تھا کہ موسیٰؑ، اللہ کے رسول ہیں۔ وہ منتظر رہے کہ موسیٰؑ سے کیا صادر ہوتا ہے۔ تاکہ خضرؑ، حضرت موسیٰ کا حقِ ادب ادا کریں۔ تو موسیٰؑ نے خضرؑ سے فرمایا، إِن سَأَلْتُكَ عَن شَيْءٍ بَعْدَهَا فَلَا تُصَاحِبْنِي، (یعنی) اس کے بعد اگر میں تم سے کسی شئے کے متعلق سوال کروں تو پھر مجھ کو اپنے ساتھ نہ رکھنا، (الکھف:۷۶)۔ پس موسیٰؑ نے خضرؑ کو اپنے ساتھ رکھنے سے منع کیا۔ جب موسیٰؑ نے تیسری دفعہ بھی سوال کیا تو خضرؑ نے ان سے کہا، هَـٰذَا فِرَاقُ بَيْنِي وَبَيْنِكَ، (یعنی) یہ جدائی ہے میرے اور آپ کے درمیان، (الکھف:۷۸)۔

موسیٰ علیہ السلام نے بھی اس پر "ایسا نہ کرو" نہ فرمایا، اور نہ ان کی صحبت میں رہنا چاہا۔ موسیٰؑ کو اپنا مرتبہ معلوم تھا جس نے خضرؑ کو اپنے ساتھ رکھنے سے منع کیا۔ موسیٰؑ خاموش ہو گئے اور دونوں میں جدائی ہو گئی۔ ذرا ان دونوں عالم شخصیتوں کے کمال کو دیکھو۔ اور احکام الٰہی کا حقِ ادب ادا کرنے کو دیکھو۔ اور خضرؑ کے موسیٰؑ کے سامنے انصاف پرستانہ اعتراف کو دیکھو۔ انھوں نے کہا کہ میں ایک جدا علم پر ہوں کہ اللہ نے مجھ کو سکھایا ہے اور آپ اس کو نہیں جانتے، اور آپ ایک جدا علم پر ہو کہ اللہ نے آپ کو سکھایا اور میں اس کو نہیں جانتا۔ خضرؑ کا موسیٰؑ سے یہ کہنا گویا دوا تھی اس زخم کی جو ان کے اس قول سے پیدا ہوا تھا، وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلَىٰ مَا لَمْ تُحِطْ بِهِ خُبْرًا (یعنی) اور آپ کیوں کر صبر کر سکیں گے اس چیز پر جس کا آپ کو علم نہیں، (الکھف:۶۸)۔ باوجود یہ کہ خضرؑ کو (موسیٰؑ کے) مرتبۂ رسالت کا علم تھا، جو خضرؑ کو حاصل نہ تھا۔

یہی بات امّت محمدیہؐ میں اس طرح ظاہر ہوئی (کہ) جب نر (کھجور) کا پھول مادہ درختِ خرما پر نہ ڈالا گیا اور لوگ اعجازِ محمدیؐ کا انتظار نہ کر سکے اور کھجوریں کم لگیں تو لوگوں نے شکایت کی اور صبر نہ کر سکے۔ سچ تو یہ ہے کہ لوگ اگر صبر کرتے تو نر پھول مادہ پر ڈالنے کا طریقہ ہی اٹھ جاتا اور پھل خوب لگتے، اور لوگ اعجازِ محمدیؐ اور آپؐ کے عالم پر پورے تصرف کو دیکھتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اصحاب سے فرمایا "تم دنیا کے کام خوب جانتے ہو"۔ یعنی اسباب کے استعمال کو۔ بے شک یہ مسلم (یعنی تسلیم شدہ) بات ہے کہ علم شئے بہ از جہل شئے (یعنی کسی شئے کا علم اس شئے کی جہالت سے بہتر ہے)۔ یہ علم ہی تو ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس سے خود کی مدح کی ہے، إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ، (یعنی) بے شک وہ سب کچھ جانتا ہے، (الشوریٰ:۱۲)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اصحاب سے فرمایا کہ وہ دنیا کے کاموں کو آپؐ سے زیادہ جانتے ہیں کہ یہ تجربے پر موقوف اور علم جزئیات سے ہے۔ اور حضورؐ کو اس کا تجربہ کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ کیوں کہ آپؐ کی توجہ ضروری تر سے ضروری تر پر تھی۔۔۔ ہم نے تم کو بڑے کام کی بات پر متنبہ کر دیا ہے۔ اگر اپنے کاموں میں اس کو استعمال کرو تو تم کو بڑا نفع ہو گا۔

پھر مجھ کو (یعنی موسیٰؑ کو) میرے رب نے حکومت و خلافت عطا کی۔ وَجَعَلَنِي مِنَ الْمُرْسَلِينَ، (یعنی) اور مجھ کو رسولوں میں سے بنایا، (الشعراء:۲۱)۔ موسیٰؑ کی اِس سے مراد، رسالت ہے۔ ہر رسول خلیفہ نہیں ہے۔ خلیفہ صاحبِ سیف (یعنی ہتھیار رکھنے والا) اور صاحبِ عزل و نصب (یعنی مسند نشین اور مقرر شدہ) ہوتا ہے۔ رسول کو ایسا ہونا لازم نہیں۔ اس کا فرض، جو نازل ہو، اس کی تبلیغ ہے۔ پس اگر احکام رسالت پر مقاتلہ اور بزور شمشیر اس کی حمایت کرے تو وہ، رسول و خلیفہ ہے۔ جس طرح کہ نبی، رسول نہیں اسی طرح رسول بھی خلیفہ نہیں۔ یعنی رسول کو ملک و حکومت ضروری نہیں۔

فرعون کی ماہیت الٰہیہ سے سوال میں کیا حکمت ہے۔۔؟ اس نے پوچھا،وَمَا رَبُّ الْعَالَمِينَ،(یعنی) ربّ العالمین کی حقیقت کیا ہے،(الشعراء:۲۳)۔ شیخ (ابن عربیؒ) کا خیال ہے کہ فرعون کا یہ سوال نادانستہ نہ تھا، بلکہ امتحانًا تھا۔ دیکھے کہ موسیٰؑ دعوائے رسالت کے ساتھ اپنے رب کے متعلق کیا جواب دیتے ہیں۔ شیخؒ کا خیال ہے کہ فرعون کو رسولوں کا مرتبۂ علمی معلوم تھا۔ وہ جوابِ موسیٰؑ سے ان کے صدقِ دعویٰ پر استدلال کرنا چاہتا ہے۔ اس نے سوال کیا تو ایسا موہم (یعنی قیاسی) سوال کیا، جس کے دو پہلو تھے۔ (پہلا یہ کہ) صحیح جواب ناممکن تھا، یعنی حقیقتِ الٰہیہ کی حد و ذاتیات بیان کرنا۔ (دوسرا یہ کہ) اگر اسم و خواص بیان کر دیں تو کہہ دے کہ جواب، سوال کے مطابق نہیں ہے۔۔۔ فرعون یہ تمام پہلو دار باتیں اس لیے کر رہا تھا تاکہ حاضرینِ دربار کو فکر و حیرانی میں رکھے، اور جو کچھ خود سمجھتا ہے دوسروں کو معلوم ہونے نہ دے۔ اپنی جھوٹی خدائی باقی رکھے۔۔۔ ظاہر ہے کہ جو چیز بسیط ہوتی ہے اس کی جنس و فصل نہیں ہوتی۔ جب جنس و فصل نہیں ہوتی تو حد بھی نہیں ہو سکتی۔ ناچار حقیقتِ حال کے جاننے والے، خواص و افعال بیان کریں گے جو رسم ہو گی۔ موسیٰؑ کے ایسے جواب دینے پر (وہ) کہے گا کہ موسیٰ کا جواب میرے سوال کے مطابق نہیں۔ (تاکہ) جہال حضارِ دربار (یعنی جاہل درباری) اپنی کم فہمی کی وجہ سے سمجھیں کہ فرعون، موسیٰؑ سے زیادہ عالم ہے۔

جب موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے سوال وَمَا رَبُّ الْعَالَمِينَ کے جواب میں کہا،رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَاإِن كُنتُم مُّوقِنِينَ،[(یعنی) وہ آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان جو کچھ ہے سب کا رب ہے، اگر تم یقین کرو،(الشعراء:۲۴)]۔ جو بظاہر سوال کا جواب ہے۔ فرعون کو معلوم تھا کہ یہی جواب دیا جائے گا۔ مگر اپنے درباریوں سے کہہ دیا،إِنَّ رَسُولَكُمُ الَّذِي أُرْسِلَ إِلَيْكُمْ لَمَجْنُونٌ،(یعنی) بے شک یہ تمھارا رسول جو تمھاری طرف بھیجا گیا، مجنون ہے،(الشعراء:۲۷)۔ میرے سوال کا جواب تک دینا نہیں جانتا۔ کیوں کہ اصل جواب تو مقصود نہیں، ممکن ہی نہیں۔

سوال صحیح ہے کیوں کہ ماہیت (یعنی اصل یا امتیازی وجہ) سے سوال کرنا مطلوب کی حقیقت سے سوال کرنا ہے۔ اور وہ حقیقت اپنے غیر سے ممتاز ہے۔ جن لوگوں نے حدود کو جنس و فصل سے مرکب مانا ہے اس جگہ ہے جہاں کوئی مشترک چیز نکلتی ہے۔ جو شئے بسیط (یعنی نہایت ہی وسیع و عریض) ہے۔ جس کی جنس نہیں ہے اُس کی فصل بھی نہیں۔ مابہ الاشتراک (یعنی اس کا مشترک) نہیں تو مابہ الامتیاز (یعنی اس سے ممتاز) بھی نہیں۔ پس اس سوال کا اہلِ حق اور صاحبِ علم و صحیح و عقلِ سلیم کے پاس جواب وہی ہے جو موسیٰؑ نے دیا۔

یعنی جب حد ممکن نہ ہو تو رسم سے جواب دیں گے۔ حقیقت، ناقابل ادراک (اور) ناقابل بیان ہو تو اس کے افعال سے اور آثار سے اس کو ماننا پڑے گا۔

یہاں ایک بڑا راز ہے۔۔۔ موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا تو مفعول پر اثرِ فعل بتا دیا، اُس شخص کے مقابل جو حدِّ ذاتی سے سوال کرتا ہے۔ پس حدِّ ذاتی نے بظاہر صورِ عالم کی طرف اضافت بتلادی، یا وہ ذات بتلادی جس سے صورِ عالم ظاہر ہوتے ہیں۔ گویا موسیٰؑ نے فرعون کے سوال کے جواب میں یعنی وَمَا رَبُّ الْعَالَمِينَ (الشعراء:۲۳) کے جواب میں رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ (الشعراء:۲۴) کہنے کے معنیٰ یہ ہوئے کہ ربّ العالمین جس میں صورِ عالمین عُلوی (یا اوپر) جیسے آسمان، اور سفلی (یا نیچے) جیسے زمین۔ (وَمَا بَيْنَهُمَا) اور جو آسمان و زمین کے درمیان ہے۔ إِن كُنتُم مُّوقِنِينَ، اگر تم کو یقین ہے۔ یا (پھر)، ربّ العالمین وہ ہے جو ان سب میں ظاہر ہے۔

جب فرعون نے اپنے ہم نشینوں سے کہہ دیا، لَمَجْنُونٌ، یہ {موسیٰ} تو دیوانہ ہے۔ جیسا کہ ہم نے اس سے پیشتر مجنون ہونے کے معنیٰ میں کہا۔ موسیٰؑ نے اور توضیح کی تاکہ فرعون ان کے علم الٰہی کے مرتبے کو جانے۔ شیخؒ کہتے ہیں کہ فرعون ان سب باتوں کو جانتا تھا۔ موسیٰؑ نے فرمایا، رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ، (یعنی) مشرق و مغرب کا رب ہے، (الشعراء:۲۸ اور المزمل:۹)۔ اس میں اعتبار یہ ہے (کہ) جو ظاہر ہے اور جو پوشیدہ ہے یعنی ظاہر و باطن سب کی اصل وہی ہے۔ اور جو درمیانی حالت میں ہے اس کی بھی اصل اور اس کا قیوم وہی ہے۔ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ، (یعنی) وہ سب کچھ جانتا ہے، (البقرۃ:۲۹ اور کئی اور آیات میں)۔ اگر تم کو کچھ 'عقل' ہے یعنی اصحابِ تقئید و تعین ہو، کیوں کہ 'عقل' کے معنیٰ ہی ہیں قید کرنا اور اونٹ کا پاؤں باندھنا۔

پہلا اہلِ تعین کا جواب ہے۔ اور وہ اہلِ کشف و وجود ہیں۔ ان کے لیے کہا، إِن كُنتُم مُّوقِنِينَ، (الشعراء:۲۴) یعنی اگر تم اہل کشف و وجود ہو، تو میں نے وہ بات کہہ دی جس کا تم کو اپنے شہود و وجود میں یقین حاصل ہو چکا ہے۔ اگر تم اس صنف سے نہیں ہو، تو میں نے دوسرا جواب دیا۔ [إِن كُنتُمْ تَعْقِلُونَ، (الشعراء:۲۸)] (یعنی) اگر تم صاحب عقل و تقئید ہو۔ اور خدائے تعالیٰ کو اپنے دلائل عقلیہ سے جو نتیجہ نکلتا ہے اس میں محصور سمجھتے ہو۔ موسیٰ علیہ السلام نے کشفی و عقلی دونوں وجہوں کو ظاہر کر دیا، تاکہ فرعون ان کی فضیلت و صداقت کو جان لے۔ شیخؒ کہتے ہیں، موسیٰؑ جانتے تھے کہ فرعون ان کی فضیلت و صداقت کا پہلے سے علم رکھتا تھا۔ یا اُس وقت (تو) رکھتا (ہی) تھا کیوں کہ اس نے ماہیتِ حقہ کا سوال کیا۔ پس موسیٰؑ نے جان لیا کہ فرعون کا سوال ماہیت سے اصطلاحِ قدما و حکما کے موافق نہیں ہے۔ اسی واسطے موسیٰؑ نے (ایسا) جواب دیا۔ اگر اس کے سوا کچھ اور جانتے تو فرعون کے سوال ہی پر اعتراض کرتے۔ اس کو خطاکار ظاہر کرتے۔

جب موسیٰؑ نے مسئول عنہ یعنی حق تعالیٰ کو عینِ عالم بنایا تو فرعون نے اس زبان میں تخاطب کیا۔ حالاں کہ قوم فرعون کو اس کا شعور بھی نہ تھا۔ پھر فرعون کے کہا،لَئِنِ اتَّخَذْتَ إِلَـٰهًا غَيْرِي لَأَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُونِينَ، (یعنی) اگر تو میرے سوا کسی اور کو معبود بنائے گا تو میں تجھے قید کر دوں گا،(الشعراء:۲۹)۔سجن میں "سین" حروفِ زوائد سے ہے۔ اور سین کے جانے کے بعد "جن" رہ گیا۔

مترجم کہتا ہے،(مولانا صدیقیؒ فرماتے ہیں): علماے ادب کے پاس سین زائد نہیں،فا کلمہ ہے۔

جِن کا مادّہ جنن ہے نہ کہ جَن۔ بہر حال یہ مقام، اعتبار کا ہے۔

میں تجھ کو چھپا دوں گا۔ کیوں کہ تو نے وہ جواب دیا ہے جس سے میری تائید ہوتی ہے کہ میں تجھ سے یہ بات کہوں۔ او موسیٰ! اگر تو زبانِ توحید سے مجھ سے کہے۔۔۔ او فرعون! تو بڑا نادان ہے۔ ایک ہی ذات کے جلوے بھی سمجھتا ہے اور پھر مجھے ڈراتا دھمکاتا بھی ہے۔ توحید اور پھر تفریق کیسی۔۔! فرعون کہتا ہے، میں تفریق و تمیز کرتا ہوں ذاتِ واحد کے مراتب میں۔ ذاتِ واحدہٗ میں نہ تفریق ہے نہ تقسیم۔ اس وقت میرا مرتبہ تجھ پر فعل سے حکومت کرنے کا ہے۔ اور ذاتِ حقہ کے لحاظ سے میں اور تو جدا جدا نہیں ہیں۔ موسیٰؑ نے جب فرعون کی بات سن لی تو فرعون کو اس کا حق ادا کر کے فرمایا۔ تو مجھ پر حکومت نہیں کر سکتا۔ حالاں کہ حق تعالیٰ کو فرعون کے رتبے میں باعتبار ظاہری کے اس مجلس میں رتبۂ ظاہر، موسیٰؑ پر حقِ تحکم تھا۔ موسیٰؑ فرماتے ہیں۔ تیرے ظلم و تعدّی نے تیری حکومت و زبردستی مجھ پر باقی نہ رکھی۔ فرماتے ہیں، أَوَلَوْ جِئْتُكَ بِشَيْءٍ مُّبِينٍ،(یعنی) کیا اگر میں تیرے پاس روشن معجزہ لاؤں تو بھی {حکومت کر سکتا ہے}،(الشعراء:۳۰)۔ فرعون سے کچھ بن نہ پڑی۔ کہنے لگا،فَأْتِ بِهِ إِن كُنتَ مِنَ الصَّادِقِينَ،(یعنی) سچے ہو تو کھلا معجزہ لاؤ،(الشعراء:۳۱)۔ فرعون نے یہ بات اس لیے بھی کہی کہ ضعیف العقل حاضرینِ دربار کے سامنے اس کی ہٹ دھرمی و ناانصافی ظاہر نہ ہو جائے۔ لوگ فرعون کے متعلق شک کرتے تھے۔ اور فرعون ان کو خفیف العقل احمق سمجھتا تھا۔ فَأَطَاعُوهُ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا فَاسِقِينَ،(یعنی) لوگوں نے فرعون کی اطاعت کی، وہ تو فاسق قوم تھی،(الزخرف:۵۴)۔ یعنی مقتضاے عقلِ صحیح سے نکل جانے والی قوم تھی۔ کیوں کہ فرعون نے زبانِ ظاہر سے جو ادّعا کیا تھا اس سے عقل انکار کرتی ہے۔ عقل کی بھی ایک حد ہے، صاحبِ کشف و یقین جب اس سے تجاوز کرتا ہے تو اپنے مقام پر ٹھیر جاتی ہے۔ لہٰذا موسیٰؑ نے ایسا جواب دیا کہ صاحبِ کشف و یقین اور صاحبِ عقل دونوں اس کو قبول کر لیں۔ فَأَلْقَىٰ عَصَاهُ(یعنی) پس {موسیٰؑ نے} اپنا عصا ڈال دیا،(الاعراف:۱۰۷ اور الشعراء:۳۲)۔

عصا کیا تھا، وہ دعوتِ موسیٰؑ سے فرعون کے عصیان (یعنی نافرمانی) و انکار کی صورت تھی۔فَإِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِينٌ ،(یعنی) وہ تو بیّن اژدھا تھا،(الاعراف:۱۰۷ اور الشعراء:۳۲)۔ پھر معصیت و شر، طاعت و خیر سے مبدّل ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ،يُبَدِّلُ اللَّـهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ (یعنی) اللہ بدل دیتا ہے ان کے سیئات (گناہوں) کو حسنات (نیکیوں) سے،(الفرقان:۷۰)، یعنی حکم میں۔۔۔ یہاں حکم ظاہر ہوا کہ حقیقتِ عصا و ثعبان {اژدہا} ایک ہی جوہر میں 'عصا' و' اژدہا' کی صورتوں میں ظاہر ہے۔ عصاے موسیٰؑ، اپنے جیسے یعنی ساحروں کے سانپوں کو نگل گیا، کیوں کہ وہ سانپ کی شکل میں تھا۔۔۔ اور عصاے موسیٰؑ، نگل گیا عصاؤں کو، اس لیے کہ وہ خود بھی عصا تھا۔

موسیٰ علیہ السلام کی حجت، فرعون کی حجتوں پر غالب آگئی، جو عصاؤں، سانپوں اور رسیوں کی صورت میں تھیں۔ ساحروں کے پاس رسیاں تھیں۔ موسیٰؑ کے پاس رسی نہ تھی۔ حبل کے معنیٰ عربی میں رسی اور چھوٹے ٹیلے کے ہیں۔ غرض یہ کہ ساحروں کا علم بمنزلہ ٹیلوں کے تھا۔ خیالی تھا۔ اور موسیٰؑ کا علم بمنزلہ کوہِ بلند کے (یعنی بڑے پہاڑ کی مانند) تھا۔ نفس الامری و واقعی تھا۔

جب ساحروں نے یہ دیکھا تو موسیٰؑ کے مرتبے کو جان لیا۔ اور یہ کہ انھوں نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا وہ مقدور و طاقتِ بشری سے خارج ہے۔ اگر انسان کی مقدور میں ہو بھی تو اس کو ہو گا جو علم حقیقی و الہامی میں تمیز کر سکتا ہو۔ کیوں کہ معجزۂ موسیٰؑ سے عصا، نفس الامر و واقع میں اژدہا بن گیا تھا اور ساحروں کے عمل سے لوگوں کے خیالوں میں رسیاں، سانپ معلوم ہونے لگیں۔ غرض یہ کہ صاحبِ فن ساحر، ربُّ العالمین (اور) ربِّ موسیٰؑ و ہارونؑ پر ایمان لائے، یعنی وہ رب جس کی طرف موسیٰؑ و ہارونؑ کی دعوت تھی۔ ان کو معلوم تھا کہ قوم جانتی ہے کہ موسیٰؑ و ہارونؑ فرعون کی خدائی کی دعوت نہیں دیتے۔

چوں کہ فرعون عہدے و منصبِ حکومت پر تھا۔ صاحبِ وقت اور حاکم و خلیفہ، صاحبِ شمشیر تھا۔ اگرچہ زبانِ شرع میں ظالم تھا۔ اسی لیے کہہ اٹھا،أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَىٰ،(یعنی) میں تمھارا اعلیٰ پروردگار ہوں، (النّازعات:۲۴)۔ یعنی اگرچہ ہر ایک میں کچھ نہ کچھ شانِ ربوبیت ہے مگر میں سب سے اعلیٰ ہوں۔ اس لیے کہ مجھے تم پر ظاہری حکومت ملی ہے۔ ساحروں نے موسیٰؑ کے صدق و دعویٰ کو بہ یقین جان لیا تو انھوں نے موسیٰؑ کے فرمودہ سے انکار نہیں کیا، اور اس کا اعتراف کر لیا۔ انھوں نے فرعون سے کہا،فَاقْضِ مَا أَنتَ قَاضٍ إِنَّمَا تَقْضِي هَـٰذِهِ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا،(یعنی) {او فرعون!} تو اِس دنیوی زندگی کو ختم کر سکتا ہے جو حکم دینا چاہتا ہے دے،

(طٰہٰ:۷۲)۔ آج تیری باری ہے۔ پس فرعون کو ایک طرح سے حق تھا کہ کہے ،أَنَارَبُّكُمُ الْأَعْلَىٰ، میں تمھارا بڑا رب ہوں، پالنے والا ہوں۔ اگرچہ فرعون ذاتِ حق سے جدا نہ تھا، مگر صورت تو فرعون کی تھی۔

اس نے ان ساحروں کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیے۔ ان کو سولی دے دی۔ یعنی حق صورتِ باطل میں تھا کہ غریب ساحروں کو اس کے بغیر مرتبۂ شہادت حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔

اسباب و عقل کا تعطل ممکن نہیں۔ کیوں کہ نظام حکمت بالغہ جزو ہیں، اور اعیان ثابتہ و علم الٰہی کا جزو ہیں۔ ہر شئے وجودِ خارجی کی اسی طرح نمودار ہوتی ہے جس طرح علم و ثبوت میں تھی۔ کیوں کہ (اللہ تعالیٰ فرماتا ہے)،لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللَّـهِ ،(یعنی)کلماتِ اللہ میں کوئی تبدیلی ہو سکتی،(یونس:۶۴)۔ کلماتِ اللہ کیا ہیں۔؟ موجوداتِ خارجی ہیں۔ موجوداتِ خارجی کی طرف قدم منسوب ہوتا ہے اعیانِ ثابتہ و علم الٰہی کی وجہ سے۔ اور اعیانِ ثابتہ کی طرف حدوث منسوب ہوتا ہے باعتبار وجودِ خارجی و ظہور کے۔ جیسے تم کہتے ہو، حدث الیوم عندنا انسان او ضعیف،(یعنی) آج ہمارے پاس ایک آدمی یا مہمان حادث ہوا، آیا۔ اُس وقت حادث ہوا، پیدا ہوا، موجود ہوا کہنے سے، لازم نہیں آتا کہ اس سے پہلے موجود نہ تھا۔ دیکھو! اللہ تعالیٰ قدیم ہے۔ اُس کی تمام صفات قدیم (ہیں)۔ اُس کا کلام بھی قدیم ہے۔ مگر اِس کے باوجود کلام قدیم کے متعلق باعتبار عالم شہادت کے "محدث" فرماتا ہے۔مَا يَأْتِيهِم مِّن ذِكْرٍ مِّن رَّبِّهِم مُّحْدَثٍ إِلَّا اسْتَمَعُوهُ وَهُمْ يَلْعَبُونَ،(یعنی)ان کے پروردگار کے پاس سے کوئی تازہ یاد دہانی، کوئی نصیحت نہیں آتی، مگر اس کو کھیلتے ہوئے سنتے ہیں،(الانبیاء:۲)۔وَمَا يَأْتِيهِم مِّن ذِكْرٍ مِّنَ الرَّحْمَـٰنِ مُحْدَثٍ إِلَّا كَانُوا عَنْهُ مُعْرِضِينَ،(یعنی) (اللہ) رحمٰن کے پاس سے کوئی یادداشت نہیں آتی مگر یہ کہ وہ لوگ اعراض کرتے، روگردانی کرتے ہیں،(الشعراء:۵)۔ یہ تو معلوم ہے (کہ) رحمٰن، رحمت ہی کرے گا۔ اور جو رحمت سے اعراض کرے، منہ پھیرے تو اس پر عذاب ہی آئے گا۔ جو عدم رحمت ہی ہے۔فَلَمْ يَكُ يَنفَعُهُمْ إِيمَانُهُمْ لَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا سُنَّتَ اللَّـهِ الَّتِي قَدْ خَلَتْ فِي عِبَادِهِ،(یعنی)اُن کو اُن کا ایمان نفع نہیں دے سکا جب کہ انھوں نے ہمارے عذاب کو دیکھا{اور ایمان بالغیب باقی نہ رہا}، یہ اللہ کا طریقہ ہے اپنے بندوں میں،(غافر:۸۵)۔[فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ آمَنَتْ فَنَفَعَهَا إِيمَانُهَا إِلَّا قَوْمَ يُونُسَ،(یعنی) کوئی تو قریہ ایسا ہوتا کہ ایسی حالت میں ان کا ایمان لانا ان کو نفع دیتا، بجز قوم یونس کے،(یونس:۹۸)]۔{گو یہ آیت عام ہے مگر صریحًا ثابت نہیں ہوتا کہ ان کا ایمان ان کو آخرت میں بھی نفع نہ دے گا} گو کہ صرف قوم یونس کا استثنا ہے۔

شیخ (ابن عربیؒ) کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ کی مراد یہ ہے کہ دنیا کا عذاب ان سے مرتفع (یعنی برتر) نہ ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ فرعون باوجود عذاب کے گرفتارِ عذاب ہوا۔ یہ بھی اس وقت ہے کہ فرعون کو یقین ہو گیا ہو

کہ وہ دارِ آخرت میں اِسی وقت منتقل ہو جائے گا۔ قرینۂ حال سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ اس کو مرنے کا یقین نہ تھا۔ کیوں کہ اس نے آنکھوں سے دیکھ لیا کہ مسلمان خشک راستے سے گذر رہے ہیں، جو موسیٰؑ کے دریا کو

عصا سے مارنے سے پیدا ہوا تھا۔ فرعون کو اپنے مرنے کا یقین نہ تھا جب کہ وہ ایمان لایا۔ بخلاف محتضر یعنی قریب الموت آدمی کے۔ پس فرعون کو محتضر پر قیاس نہیں کیا جائے گا۔ لہٰذا فرعون اس رب پر ایمان لایا جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے تھے۔ اور شیخؒ کہتے ہیں (کہ) اس کو نجات کا یقین تھا۔ اور اس کو نجات بھی ہوئی، مگر جس طرح فرعون چاہتا (تھا) اس طرح نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی روح کو عذابِ آخرت سے نجات دی اور اس کے بدن کو ڈوبنے سے بچایا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، فَالْيَوْمَ نُنَجِّيكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُونَ لِمَنْ خَلْفَكَ آيَةً، (یعنی) آج ہم تیرے بدن کو غرق ہونے سے بچا لیں گے تاکہ تو پیچھے والوں کے لیے نشانی ہو، عبرت ہو، (یونس:۹۲)۔ کیوں کہ اگر بدن کے ساتھ غائب ہو جاتا تو شاید لوگ کہتے کہ فرعون کہیں چھپ گیا ہے۔ لہٰذا اپنے معمولی جسد کے ساتھ مردہ ظاہر ہوا۔ تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ یہی فرعون ہے۔

غرض یہ کہ شیخؒ کا خیال ہے کہ فرعون کو ظاہراً و باطناً نجات حاصل ہوئی جس پر عذابِ آخرت ثابت ہو جاتا ہے۔ وہ ایمان لاتا ہے۔ وَلَوْ جَاءَتْهُمْ كُلُّ آيَةٍ حَتَّىٰ يَرَوُا الْعَذَابَ الْأَلِيمَ، (یعنی) اگر آئے اس کے پاس ہر قسم کی نشانی یہاں تک کہ وہ دیکھ لے دردناک عذاب، (یونس:۹۷)۔ یعنی عذابِ آخرت کا مزہ چکھ لے۔ پس فرعون اس صنف سے نکل گیا۔ ظاہر قرآن سے تو یہی معلوم ہوتا ہے۔ اس پر بھی ہم کہتے ہیں کہ فرعون کی حقیقتِ حال، اللہ کے علم میں ہے۔ عام لوگوں کے دل میں فرعون کے کفر و شقاوت (یعنی سنگدلی و بد بختی) کا یقین بیٹھ گیا ہے۔ حالاں کہ ان کے پاس کوئی واضح دلیل نہیں ہے جس سے وہ استناد (یعنی ثابت) کریں۔ اب رہا آلِ فرعون کا حکم، تو ان کا حکم جدا ہے۔ یہ مقام اِس کے ذکر کا نہیں ہے۔

یہ بات معلوم رہے کہ اللہ کسی کو قبض نہیں کرتا، نہیں مارتا۔ مگر اس کو ایمان آجاتا ہے۔ یعنی اخبارات الٰہیہ و رسل علیہ السلام کی اس کو تصدیق ہو جاتی ہے۔ میری مراد محتضر قریب الموت شخص سے ہے۔ اسی واسطے آدمی موتِ فجأت و قتلِ غفلت (اور) مرگ و ناگہانی سے کراہت کرتا ہے موتِ فجأت کی تعریف یہ ہے کہ اندر کی سانس نکل کر پھر واپس داخل نہ ہو۔ یہ اور چیز ہے اور محتضر اور چیز۔ اسی طرح قتلِ غفلت ہے کہ کوئی نامعلوم طور پر پیچھے سے گردن اڑا دے۔ پس وہ شخص کفر (یا) اسلام جس حال میں ہے اسی طور پر مرے گا۔ اسی واسطے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، "جیسے مروگے ویسے اٹھوگے"۔ یعنی کفر و اسلام جس پر مرے ہیں اسی پر حشر کیے جائیں گے۔ کیوں کہ قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، کما انّہ علیٰ ما کان علیہ (یعنی وہ اُسی پر ہے جس پر پہلے بھی تھا) میں کان، حرفِ وجودی ہے۔ وہ زمانے پر بغیر قرائن و احوال کے دلالت

نہیں کرتا ہے۔ لہٰذا بہت فرق ہے کافر محتضر یعنی قریب الموت اور کافر مقتول بحالِ غفلت اور مرگِ ناگہانی سے مرنے والے میں۔ جیسے ہم نے مرگِ ناگہانی کی تعریف میں بیان کیا۔

آگ کی صورت میں موسیٰؑ سے کلام اور ان کے لیے اس صورت میں تجلی کیوں ہوئی۔۔؟ اس کی حکمت اور اس کا سرّ (یعنی راز) کیا ہے۔۔؟ موسیٰ علیہ السلام آگ لینے نکلے تھے۔ آگ ہی کی طرف ان کی پوری توجہ اور اس کی طرف یکسوئی تھی لہٰذا جس کی طلب میں نکلے تھے اس کی صورت میں تجلی ہوئی۔ تاکہ موسیٰؑ اس پر توجہ کریں اور اس سے اعراض (یعنی پہلو تہی) نہ کریں۔ اس لیے کہ اگر صورتِ غیر مطلوب میں تجلی ہوتی تو موسیٰؑ اس پر توجہ نہ فرماتے، اعراض (یا گریز) کر جاتے۔ کیوں کہ ان کی جمیع ہمت اور پوری توجہ تو مطلوبِ خاص یعنی آگ کی طرف تھی۔ اگر موسیٰؑ اعراض کرتے تو ردِ عمل ہوتا اور اللہ تعالیٰ کو بھی اعراض کرنا پڑتا، حالاں کہ وہ اللہ کے برگزیدہ، پسندیدہ (اور) مقرب پیغمبر تھے۔ اس قُرب ہی کا تقاضا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے مطلوب ہی میں تجلی فرمائی اور ان کو اس کی خبر بھی نہ تھی۔

کنار موسیٰ راٰھا عین حاجتہٖ
وھو الالٰہ ولٰکن لیس یدریہ
آتشِ موسیٰؑ کہ انھوں نے اس کو عین حاجت و مطلوب سمجھا
حالاں کہ وہ آتش، عینِ حق و تجلیِ ہدایت تھی، مگر ان کو خبر نہ تھی

خدا کی دین کا موسیٰؑ سے پوچھیے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری ہو جائے